ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن بلوچ
استاد شعبہ بلوچی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

میر گل خان نصیرؔ اور فیض احمد فیضؔ: اشتراکِ فکر و نظر

Dr. Zia urRehman Baloch
Assistant Professor, Balochi Department,
Allama Iqbal Open University, Islamabad

Meer Gul Khan Nasir and Iqbal: Commonalities in Ideas and Opinions

With unflinching devotion to his cause and insurmountable determination, the prominent poet, politician, historian and journalist Gul Khan Naseer symbolizes the soul and voice of the people of Balochistan. . His position as a literary person remains unmatched throughout Baloch history. Undoubtedly, he stands among the leading reformists of South Asia. This essay would throw lights on the personality of Mir Gul khan Naseer with its comparison to the legend poet Faiz Ahmed Faiz. Both born and nurtured into the different societies with unlike values and norms, Gul Khan Naseer and Faiz Ahmed Faiz, the two charismatic and eternally living names; They were driven close to each other by their progressive thoughts and the concern to steer the painstaking society out of misery. Indeed, poetry became the source of salvation for these two pragmatic personalities, their verses stirred the public to seek emancipation from the constructed social bonds of feudalism, misinterpreted religious discourses, extreme class and ethnic polarization. Today, they symbolize the voice of the hapless and continue to inspire millions across the country as well as across the region.

بلوچستان کے دُور افتادہ علاقے ''چاغی'' کی پہاڑیوں سے ایک ایسا آفتابِ تازہ ابھرا جس نے فکر و نظر کی قندیلیں روشن کر کے ظلمتوں میں گھرے ہوئے طبقوں کو نئے امکانات کی بشارتوں سے معمور کر دیا۔ اپنے قرب و جوار میں سسکتی اور دم توڑتی زندگیوں کے لیے وہ صرف اجالے کا پیغام ہی لے کر نہیں آیا بلکہ کئی دہائیاں وہ ان بستیوں میں نور بانٹتا اور اندھیروں کو ختم کرنے کا جتن کرتا رہا، جہاں کئی زمانوں سے ظلمتوں اور وحشتوں کا راج تھا۔ یہ آفتابِ تازہ میر گل خان نصیرؔ کی ذات تھی۔ میر گل خان نصیرؔ کا جنم ایک ایسے زمانے میں ہوا جب ہر طرف جبر و استبداد اور ظلم و ستم کا راج تھا۔ اس کے اردگرد زندگیاں غلامی

کے چنگل میں جکڑی ہوئی تھیں اور بے بسی اور بے کسی نے ہر سو ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ غیرت مند مگر مفلوک الحال، کمزور اور ناتواں لوگ صرف فرنگیوں کی غلامی ہی میں گرفتار نہ تھے بلکہ اپنے علاقے کے نوابوں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے فولادی پنجوں میں بھی اسیر تھے۔ زندگی کی رعنائیاں اور راحتیں ان پر حرام تھیں اور درد و غم ان کا مقدر تھا۔ میر گل خان نصیرؔ نے شعور کی آنکھ سے جب ان مناظر کو دیکھا تو ان کا دل ماحول کی اس تلخی پر تڑپ اٹھا۔ ان دل دوز اور روح فرسا مناظر نے ان کے اندر جابرانہ ماحول اور ظالمانہ فضا کے خلاف نفرت کا ایک الاؤ روشن کر دیا۔ کوئٹہ سے میٹرک کرنے کے بعد وہ جب مزید تعلیم کے لیے لاہور پہنچے تو یہاں ان کی فکر کو نکھرنے اور ان کے خیالات کو مزید سنورنے کا موقع ملا۔ اس وقت لاہور میں کئی آزادی پسند اور قومی تحریکیں سرگرمِ عمل تھیں۔ جوش و جذبے کی اس فضا نے ان کے اندر کے الاؤ کو مزید بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلامیہ کالج، لاہور کے زمانۂ تعلیم میں جب بلوچستان کے پہلے قومی رہنما یوسف عزیز مگسی لاہور آئے تو ریواز ہاسٹل میں انھوں نے مگسی صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا؛ اس تقریب میں پیش کردہ اپنے اُردو اشعار میں یوسف عزیز مگسی کو یوں مخاطب کیا:

اٹھ اے یوسف! تو پھر جام بقا دے قومِ مردہ کو
جو اب بیدار ہو سکتی ہے لے کر ایک انگڑائی
اٹھا ان زیر دستوں کو ذرا خاکِ مذلت سے
جگا دے خفتۂ نَے کو بہ بانگِ کارفرمائی
بلوچی زندگی کی شان پھر دُنیا کو دکھلا دے
بتا دے ان کو کر سکتی ہے کیا یہ قومِ صحرائی (۱)

لاہور میں وہ بہ وجوہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے اور انھیں واپس کوئٹہ جانا پڑ گیا مگر وہ یہاں سے ایک نیا ولولہ، ایک نیا احساس، ایک نئی سوچ اور ایک نیا جذبہ لے کر بلوچستان پہنچے جس کی وجہ سے انھیں بلوچستان کے ظالمانہ معاشرے میں جبر و ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور انقلابی نظریات کا پرچار کرنے میں بہت مدد ملی۔ گل خان نصیرؔ نے شاعری کی ابتدا اُس وقت کی جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری اُردو اور فارسی میں ہے اور رومانوی رنگ کے ساتھ ساتھ ملی اور قومی احساس سے بھی عبارت ہے؛ اس دور کی ابتدائی شاعری پر اقبال، ظفر علی خان اور مولانا حالیؔ کے اثرات نمایاں ہیں مگر لاہور سے واپسی کے بعد ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ ہی تبدیل ہو گیا۔ ترقی پسندانہ نظریات سے جذباتی وابستگی نے ان کے لہجے کو گھن گرج اور جلال و شکوہ کے ذائقے سے سرشار کر دیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث انھیں دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے قریب آنے کا موقع ملا۔ اُردو شعرا میں وہ سب سے زیادہ فیض احمد فیضؔ سے متاثر ہوئے اور زندگی بھر اُن کے ساتھ میر گل خان نصیرؔ کا ذہنی اور قلبی تعلق قائم رہا۔

فیض احمد فیضؔ اور میر گل خان نصیرؔ کا ذہنی اور فکری اشتراک انھیں ایک دوسرے کے قریب لانے کا سبب بنا۔ دونوں معاصر

شعرا کے درمیان ترقی پسندیت محرکِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں شعرا انسان دوستی کے عظیم جذبے سے سرشار تھے اور پسے ہوئے طبقوں کی بحالی ان کا مطمحِ نظر تھا۔ معاشرتی جبر، سماجی گھٹن، مزدوروں اور ہاریوں پر ستمِ ناروا، ناانصافی، وڈیروں اور استحصالیوں کے مکروفریب اور اہلِ سیاست و مذہب کے فتنوں کو دونوں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنی شاعری میں ان کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ دونوں مشاہیر نے زندگی بھر قید و بند کی اذیتیں اور نظر بندی کی صعوبتیں جھیلیں مگر دونوں اپنے نظریات اور افکار پر نہ صرف کاربند رہے بلکہ ان کا پرچار کرنے سے بھی انھیں کوئی طاقت، کوئی لالچ اور کوئی خوف نہ روک سکا۔

فیضؔ اور نصیرؔ محبت اور احترام کے لازوال رشتے میں بندھے ہوئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی شاعرانہ عظمت و رفعت کے قدردان اور معترف تھے۔ نیشنل آرٹس کونسل کی سربراہی کے زمانے میں فیض احمد فیضؔ کونسل کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے جب کوئٹہ گئے تو وہاں میر گل خان نصیرؔ اور بلوچستان کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ انھیں ملنے کا موقع ملا۔ لال بخش رند کے بقول:

> ''میٹنگ کی کارروائی کے بعد فیضؔ صاحب نے میر گل خان نصیرؔ سے مخاطب ہو کر کہا ''میں نے آپ کی نظم ''ڈیوا'' (دیا) کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ مجھے اپنی کچھ اور نظمیں دیجیے تاکہ میں ان کو اُردو میں منتقل کر سکوں۔ مجھے آپ کی نظم کا ترجمہ کر کے بہت خوشی ہوئی ہے کہ بلوچی میں ایسی بلند پایہ نظمیں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اچھی نظموں سے غیر بلوچ قارئین بھی روشناس ہوں۔'' فیض صاحب کی اس بات پر ابھوں سے خاکساری سے جواب دیا ''فیضؔ صاحب میری نظموں میں سادہ سے خیالات ہیں، ان کو ترجمہ کرنے سے کیا ملے گا؟'' (۲)

فیضؔ صاحب کے معلوم سرمایۂ تراجم میں گل خان نصیرؔ کی متذکرہ بالا نظم کا ترجمہ موجود نہیں اور نہ ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شائع ہوا ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ نظم واقعی گل خان نصیرؔ کی ایک شاہکار نظم ہے ممکن ہے فیضؔ صاحب نے خود اس کا ترجمہ نہ کیا ہو بلکہ کسی اور کا ترجمہ دیکھ کر اس نظم کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہو۔

میر گل خان نصیرؔ کی کلامِ فیضؔ سے دل چسپی اور اثر پذیری تو ''سرِ وادیِ سینا'' کے منظوم بلوچی ترجمے سے ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ ''سینائی کچگ ءَ'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں قلات پبلشرز، کوئٹہ نے شائع کیا۔ اس کی تقریبِ رونمائی میں پڑھے گئے اپنے ایک مضمون میں میر گل خان نصیرؔ نے فیضؔ کی شاعری کے حوالے سے لکھا:

> ''فیضؔ کی شاعری ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس سے ان کے اشعار موسمِ بہار کی گھٹاؤں کی طرح اٹھتے اور ذہنوں کو سیراب کرتے ہیں۔'' (۳)

جس زمانے میں میر گل خان نصیرؔ نے ''سرِ وادیِ سینا'' کا ترجمہ کیا، ان دنوں وہ جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں کاٹ رہے تھے۔ اس ترجمے کا خیال انھیں کیسے آیا اور ترجمہ کرنے میں انھیں کس طرح کی مشکلات پیش آئیں، ان کے حوالے سے وہ خود رقم طراز ہیں:

''میں پانچ سال کی ایک طویل مدت تک مچھ اور حیدرآباد کے جیل خانوں میں بیرونی دُنیا سے اوجھل پڑا رہا۔ جیل کے تلخ و تاریک دنون سے متعلق وہی شخص بہتر جانتا ہے اور بول سکتا ہے جس نے وہاں پر ایک مدت گزار کر اس کی صعوبتیں جھیلی ہوں۔ جناب فیض احمد فیضؔ نے بھی جیل کی ایک یاس انگیز زندگی دیکھی ہے اور اب جذبات و احساسات کی چبھن کا تجربہ رکھتے ہیں جو وہاں پر ایک شاعر کے حساس دل کو ٹھیس لگاتی اور بے قرار کرتی ہے اور اس کے جذبات کو ابھارا ابھار کر اس سے وہ تابناک و تابدار اشعار کہلواتی ہے جو ہر روح کو گرمانے، دل کو تڑپانے کی تاب رکھتے ہیں۔ جیل کے انھی دنوں میں مجھے فیض احمد فیضؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے کلام نے مجھے رفتہ رفتہ ایسا مسحور کیا اور میرے دل میں ایک ایسی امنگ پیدا کر دی جو کسی بھی شاعر کے دل کو جلا بخشتی اور گفتار کی لڑی میں پرونے پر مجبور کرتی ہے۔ فیضؔ کے اشعار اور جیل کی تنہائی نے مجھے ترغیب دی کہ فیضؔ کے ساتھ روحانی طور پر ایک بلوچی کچہری میں ہم آہنگ ہونے کی صورت پیدا کر دوں۔ اس وقت ان کے اشعار کا مجموعہ ''سرِ وادیِ سینا'' میرے زیرِ مطالعہ تھا، میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے ابتدا کروں۔ جب میں نے ترجمے پر کام شروع کیا تب معلوم ہوا کہ جس کام کو آسان سمجھتا تھا وہ صرف مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن بھی ہے لیکن اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری۔ جیل کی تنہائیوں میں مجھے اور کرنا ہی کیا تھا۔ بالآخر ایک طویل اور ان تھک عرق ریزی اور دماغ سوزی کے بعد جس طرح بن سکا میں نے سرِ وادیِ سینا'' کا بلوچی میں منظوم ترجمہ مکمل کر ہی لیا۔'' (۴)

فیضؔ اور گل خان نصیرؔ کی شاعری کے مطالعے سے دونوں کے فکر و نظر کا اشتراک نہایت ابھر کر سامنے آتا ہے۔ دونوں شاعر اگرچہ دو مختلف زبانوں میں شعر گوئی کرتے رہے مگر موضوعات، اسالیبِ بیاں، لفظیات اور تکنیکی تجربوں میں دونوں کے درمیان حیرت انگیز مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب تو یہی ہے کہ دونوں کا سرچشمۂ خیالات اور نصب العین ایک ہی تھا اور دونوں کے سامنے زندگی ایک جیسے تلخ حقائق کے ساتھ موجود تھی۔ دونوں شعرا کا مزاج بہ یک وقت رومانی اور انقلابی تھا۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں دل کی واردات اپنی چھب دکھا کر روپوش ہو جاتی ہے۔ غمِ دل کی وارادت کو بیان کرتے کرتے جب ان کی نگاہ غمِ زمانہ سے دوچار ہوتی ہے تو ان کا رنگِ سخن کروٹ بدل کر حقیقت نگاری کی تلخیوں کو بیان کرنے لگتا ہے۔ فیضؔ اپنی مقبول نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں جس کیفیت کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں ایسی ہی کیفیت گل خان نصیرؔ کی نظم ''مہرِ زناناں'' میں دکھائی دیتی ہے۔

فیض کا انداز ملاحظہ ہو:

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ وبازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ(۵)

اسی طرزِ احساس کو میر گل خان نصیرؔ کے ہاں دیکھیے:

یہ نہ سمجھو میرے دل میں جذبۂ الفت نہیں
میری نظروں میں جمال وحسن وخال وخط کی کُچھ قیمت نہیں
آہ لیکن کیا کروں اِس آتشِ سوزاں کو میں
جو بھڑکتی ہے میرے سینے میں پیہم رات دن
کیا کروں اس دیدۂ گریاں کو میں
جس سے خونِ دل ٹپکتا ہے سدا
اس کو میں کیسے چھپاؤں کیا کروں
کس قدر غمناک ہیں میرے وطن کے روز وشب
ہر طرف ہے لوٹ کا بازار گرم
بھوک اور افلاس کی عفریت ہر سو خندہ زن
ملتوی رکھوں بھلا کب تک حصولِ حق کی جنگ
یہ نہ سمجھو میرے دل میں جذبۂ الفت نہیں(۶)

قلتِ وقت کے پیشِ نظر مزید مثالوں اور شعری نمونوں سے صرفِ نظر کرتا ہوں ورنہ دونوں شاعروں کے کلام میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ فیضؔ جب ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کہہ کر حالات پر اپنا تبصرہ کرتے ہیں تو ایسا ہی تبصرہ میر گل خان نصیرؔ کے ہاں ''کیسے مانوں کہ مرا دیس بھی آزاد ہوا'' کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ فلسطین، ویتنام اور افریقہ پر لکھی گئی منظومات میں دونوں ترقی پسند شعرا کا نقطۂ نظر ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ جیلوں کے تجربات اور قید وبند کی صعوبتیں دونوں شعرا کے

ہاں ایک ہی احساس کو ابھار کر شعر کے پیکر میں ڈھلتی اور نظموں کے بطون میں جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔

میر گل خان نصیرؔ اور فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کے اکابر ترقی پسند شعرا ہیں۔ دونوں کے ہاں فکر و نظر کی حیرت انگیز مماثلت اور طرزِ احساس میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دونوں شعرا نے اپنی اپنی زبانوں کے شعری افق کو اپنی توانا آوازوں سے نئے منظروں سے ہم کلام کیا، پرانی لفظیات کو نئے رنگ و آہنگ سے ہم کنار کیا اور جدید شعری منظر نامے پر وہ پھول کھلائے جن کی بو باس انفرادیت کے رنگوں میں رنگی ہوئی ہے جو فکر و نظر اور ذہن و دل کی دُنیاؤں کو تادیر اپنا اسیر رکھتی ہے۔

حواشی

(۱) یوسف عزیز مگسی: ''میر گل خان نصیرؔ کی شاعری، ایک جائزہ'' (مضمون) مشمولہ: میر گل خان نصیر زندگی اور فن؛ کوئٹہ؛ بلوچی لبزانکی دیوان؛ ۲۰۱۴ء؛ ص ۳۷۔

(۲) لال بخش رند:؛ ''میر گل خان نصیرؔ: شاعرِ انقلاب'' (مضمون) مشمولہ میر گل خان نصیرؔ: شخصیت، شاعری اور سیاست؛ کراچی؛ عوامی ادبی انجمن؛ ۱۹۸۶ء۔

(۳) میر گل خان نصیرؔ: ''میں اور میرا فن'' (مضمون) مطبوعہ روزنامہ مشرق، کوئٹہ؛ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء۔

(۴) ایضاً

(۵) فیض احمد فیضؔ: نقشِ فریادی؛ لاہور؛ مکتبۂ کاروان؛ س ن؛ ص ۶۹-۶۸۔

(۶) میر گل خان نصیرؔ/ انوار احسن صدیقی: ناآشنائے الفت (نظم) مشمولہ: ادبیات؛ اسلام آباد؛ اکادمی ادبیات پاکستان؛ جنوری تا جون ۲۰۱۱ء؛ ص ۲۲۱-۲۲۰۔